



جادو

<https://www.facebook.com/groups/372605677178945/>

ہندو کے ایک ممتاز ادیب سوڈیشے دیپکے کے قلم سے

خوش مزہ داستانیں کے لیے * اسی ماہ کی خاص کتاب * ترجمہ * عائشہ زملہ

ایک گھر کا قصہ جہاں ایک ماں رہتے تھے

سے بک دوش ہونے کے بعد باپ کو چالیس روپے پنشن مل رہی تھی۔ پنشن کے وقت اور بہن کی شادی کے موقع پر بڑا لڑکا پہنچا تھا اور اس نے باپ کی ضرورتیں بھی پوری کی تھیں۔ اُس سے جو ہو سکا تھا، اُس نے کیا تھا مگر یہ بات ماں کے کان میں پڑ گئی تھی کہ بیٹے کو بے وجہ کہیں آنا جانا اچھا نہیں لگتا۔ اُسے بہت غصہ آیا تھا۔ شوہر نے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ لگے وقتوں کی اُن پڑھ عورت تھی آج کے آدمی کی طرح جواز اور منطق کی بنیاد پر سوچنا اُسے نہیں آتا تھا۔ وہ بھگتی کیا اپنا خون، اپنے لڑکے اب بس ضرورت پڑنے پر ملے جلتے ہیں؟ پیار، محبت بھی تو کوئی چیز ہے۔ وہ پڑھ لکھ کر بالکل خشک ہو گیا ہے۔

لڑکے نے ساری تعلیم ماں کے تعاون سے حاصل کی تھی۔ اُس کی کامیابی کا سہرا ماں کے سر بندھا تھا۔ اُس نے کلچر کی تعلیم کے معاملے میں ڈٹ کر لڑکے کا ساتھ دیا تھا۔ اُس طرح لڑکے نے تعلیم حاصل کی پھر اُسے ایک اعلیٰ نوکری مل گئی۔ وہ

بڑے لڑکے نے خط لکھا تھا کہ وہ چار دن کے لیے اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ آ رہا ہے۔ ماں اُن پڑھ ہونے کے باوجود پوسٹ کارڈ کی تحریر سے پہچان گئی تھی کہ یہ سنٹوش کا خط ہے۔ شوہر بازار سے لوٹا تو اُس نے کہا: ”دیکھنا یہ سنٹوش کا خط ہے نا؟ کیا لکھا ہے؟ وہ لوگ آ رہے ہیں نا؟“ وہ ہمیشہ سے ایک ساتھ کئی سوالات کرنے کی عادی تھی جب بھی بڑے لڑکے کا خط آتا، وہ یہی بندھے ہوئے سوالات کرتی۔ بڑا لڑکا خط زیادہ لکھتا تھا، آتا کم تھا۔ باپ کو اُس کے خط کا مضمون بتانے کے بعد ہمیشہ ماں کی دل جوئی کرنی پڑتی لیکن آج بیٹے کے آنے کی خبر سے کر اُس کے دل میں بھی مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اُسے دکھا دے اور نمائش پر یقین نہیں تھا۔ لڑکا سال سال بھر نہ آئے اُسے شکایت نہیں ہوتی تھی۔ ایک بار لڑکا بہت دنوں تک نہیں آیا تھا، باپ نے وجہ پوچھی تھی، لڑکے نے جواب دیا تھا، اُسے بے وجہ کہیں آنا جانا اچھا نہیں لگتا۔ ویسے جب باپ کو کوئی ضرورت پڑتی یا کوئی کام ہوتا، لڑکا ضرور آتا تھا۔ نوکری

اُسے دیکھا تھا۔ اب وہ پورے جلے بولنے لگی تھی۔ دادا کو بیڑی سلگاتے دیکھ کر اُس نے پوچھا: آپ کیا پی لے رہے ہیں؟“

”بیڑی“

اپنے باپ کو وہ سگریٹ پتے دیکھ چکی تھی مگر بیڑی کا لفظ اُس کے لیے نیا تھا۔ ”بھوٹ بولتے ہو سگریٹ ہے سگریٹ۔ اہ۔“ دادی نے مینو کو پھر اپنی گرد میں کھینچ لیا اور اُسے چوما۔

”مائے رام! کتنی سیانی باتیں کرنے لگی ہے۔“

بابر دودھ والا آیا۔ ماں برتن اٹھا کر باہر گئی پھر وہیں سے آواز دے کر پوچھنے لگی۔ ”کاکا! کتنا دودھ فالٹو لینا ہے؟“ سنیکوش نے بیڑی سے پوچھا اور ماں کو بتانے باہر آیا۔ کچھ اور لوگ دودھ لے رہے تھے۔ اُس نے ماں سے کہا۔

”جبنا روز لیتی ہوتا تھا ہی لے لو۔“

”کاکا! ہم تو روز بس ایک پاؤ لیتے ہیں۔ دو وقت کی چائے ہی تو بنانی ہوتی ہے۔“

لوٹ کے نے یہ بتاتے وقت خود کو قصور وار محسوس کیا کہ مینو کے لیے دو کلو دودھ لے لو۔ دو کلو سن کر ماں کا چہرہ ایک لمحے کے لیے بجھ گیا۔ لوٹ کے کو یاد آیا، گھر میں ہمیشہ اتنا ہی دودھ آتا رہا ہے۔ پانچ بھائی بہنوں میں جب کبھی کوئی بیمار پڑ جاتا تھا تب اُسے دودھ ملتا تھا، دوا کے طور پر۔ اُس وقت سے آج تک دودھ دیکھتے ہی اُسے بیماری کا احساس ہونے لگتا تھا۔ اب اُس کے اچھے دن تھے پھر بھی دودھ سے اُسے نفرت تھی۔ وہ دل ہی دل میں حساب لگانے لگا کہ مینو مرے چار دن میں بیاں کے پورے مینے کے دودھ کا بجٹ مٹی جائے گی۔

ماں نے ناشتہ تیار کر لیا تھا۔ پائے، چائے، اچار، چھائی صدی سے ایک ہی فرسٹ چلی آرہی تھی۔ مینو دلدی کی گرد میں بیٹھ گئی۔ اب وہ دو چار لقمے کھانے لگی تھی۔ دلدی اناٹا نہیں بنایا؟ ”کرے میں یک لخت خاموشی چھا گئی۔ سنیکوش نے کہا: ”اچھی بیٹیا! آج یہی کھا لو۔ کل انڈیاں کھاؤ۔“

ہو صفائی پیش کرے لگی۔ گھر میں بھی تو کبھی کبھی بس تھوڑا سا کھاتی ہو۔“

مینو نے جواب دیا: ”ماں جھوٹی، ماں جھوٹی۔ میں تھوڑا سا

نہیں کھاتی، ایک کھاتی ہوں، ایک۔“

سنیکوش نے اُسے ڈانٹ دیا۔ دلدی نے بابر سے کہا کہ شام کو انڈے پتے آئیں۔ اُس کا آن پڑھ دماغ یہ حساب بھی لگا رہا تھا کہ رات کی سبزی کے پیسے انڈے کھا جائیں گے۔

اب بھی سب سے کتنا تھا کہ اُسے تعلیم دلانے اور بنانے والی اُس کی ماں ہے۔ اُس کا یہ اعتراف سن کر ماں کو بے پایاں خوشی ہوتی لیکن ایک دکھ اُسے ہمیشہ ستاتا، لوٹ کے کو ملازمت دوسرے شہر میں ملے تھی اس لیے اُس کا گھر آنا جانا کم ہو گیا تھا۔ کنوارا تھا تو کوئی بات نہیں تھی۔ پھر اُس کی شادی ہوئی اور بچی بھی ہو گئی۔ ماں نے سوچا کہ اب وہ مینے میں عم سے عم ایک بار ضرور اُسے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ پڑوسی اکثر اُس سے پوچھتے: ”تمہاری بہو اب بیٹیا نہیں آتے؟ کیا بات ہے؟“ ماں سخت محسوس کرتی، لوگ تو کہتے ہیں یہی سوچتے ہیں گے کہ لوٹ کے اور بہو سے اس کی منتی نہیں ہے۔

اور اب لوٹ کے کی آمد کا خط ملا تھا اُس نے شہر سے پھر پوچھا: کس تاریخ کو آرہا ہے؟ کتنے دن لے گا؟ پتہ نہیں کپڑے بھی ساتھ لاتا ہے یا نہیں۔ دونوں بے پروا ہیں۔ مینو کے بالے میں کچھ نہیں کھا؟ مجھے یاد کرتی ہے نا؟ ”بابو جی نے سارے سوال سنے، ضروری سوال پچھنے اور بولے۔ وہ لوگ کل صبح آئیں گے۔ چار پانچ دن رہیں گے۔“

دادی کو اپنی پوتی مینو کے آنے کی خوشی لوٹ کے کے آنے سے زیادہ تھی۔ وہ سوچنے لگی مینو تین سال کی عمر میں کتنی باتیں کرتی ہے۔ لوٹ کا اور بہو تو بس چپ رہتے ہیں انھیں آپس میں بھی زیادہ باتیں کرتے نہیں دیکھا، ماں سے کیا باتیں کریں گے۔ پہلے میں ان سے ملنے جاتی تھی تو صبح جا کر شام کو لوٹ آتی تھی لیکن جب سے مینو نے بولنا شروع کیا ہے، دو تین دن رہ جاتی ہوں۔ مینو اپنی دادی پر گئی ہے اُسے دادی کی عادتوں کا پتہ ہے۔ چلو اچھا ہوا لوٹ کے کے گھر بھی بہک بہک کرنے والی لوٹ کی پیدا ہو گئی۔ کوئی تو آیا گھر کی چپ توڑنے۔

وہ صبح سے صفائی میں لگی تھی۔ بیج بیج میں پڑوس میں جا کر بتا آتی کہ آج بڑا آرہا ہے، پورے چار دن کے لیے اس اطلاع کا مقصد یہ جتنا تھا کہ بیٹے اور بہو سے ہماری منتی ہے ایسی ویسی کوئی بات نہیں۔

بابر کٹار کٹنے کی آواز آئی۔ وہ دوڑ کر دروازے پر پہنچی۔ رکشائیں رکھا ہوا سوٹ کیس دیکھ کر اُسے یقین ہو گیا کہ یہ لوگ کچھ دن ٹھہریں گے۔ اُس نے دوڑ کر مینو کو گرد میں اٹھالیا۔ لوٹ کا سوٹ کیس اٹھا کر اندر آیا۔ بہو سے نمٹے ہوئی۔ حال چال پوچھنے پر بہو نے سر ہلایا۔ اُسے بہو کے اس رویے سے تکلیف ہوتی تھی کہ وہ کھلتی نہیں۔

دادی کے بعد دادا نے مینو کو اٹھالیا۔ آج کئی مینے بعد

سب بگ

تو نہیں ہو جائیں گے؟“ دادا نے اس کا سر تھپ تھپا کے
چھونے کی اجازت دے دی، ساتھ ہی پتے نہ توڑنے کی
ہدایت بھی کی۔

تھوڑی دیر بعد مینو نے پوچھا: دادا! خوب صورت پھول
کہاں ہیں؟ اس کے گھر کا آئین سارا سال رنگ برنگے پھولوں
سے مسکارتا تھا، وہ پھولوں پر اڑتی ہوئی تلیوں کے بچے نقد
لگاتی تھی۔ اسے دادا کے جواب کا انتظار تھا۔ اس نے پھر سوال
کیا: دادا! تلیاں کہاں ہیں؟“ سبز لیل کے پورے ہلنے سے
اُن پر بیٹھے ہوئے پتھر اڑے، ایک دوئے مینو کو کاٹ بھی
لیا۔ وہ دادا کی خاموشی اور پتھروں کے کاٹنے سے جھنجھلا گئی۔ دادا!
یہ پورے توڑ دو۔ گندے بھی۔ پتھر کا ٹٹا ہے۔“

دادا کے پاس اس کے سب سوالوں کے جوابات تھے
لیکن انھیں جواب دینے کی ہمت نہیں ہوئی کیونکہ انھیں پھولوں
اور سبزی کا فرق معلوم تھا۔ مینو کا کیا قصور ہے: بچپن میں شاید انھیں
بھی پھول اور تلیاں اچھی لگتی تھیں۔ کچھ بڑے ہونے پر زندگی
کی حقیقتیں معلوم ہوئیں اور وہ خود بخود پھولوں اور تلیوں کو پھول
گئے۔ مینو کے سوالوں نے انھیں اندازے ہلا دیا۔ اُن کا جی چاہا،
اسی وقت کھڑا اٹھائیں اور سبزی کے پورے جڑ سے کاٹ
کر پھینک دیں اور وہاں پھول لگا دیں تاکہ پھولوں پر تلیاں
اڑتی رہیں۔ وہ خود اپنے آئین میں پھول کبھی نہیں دیکھ سکے
تھے، اُن کا بیٹا سنتوش بھی نہیں دیکھ سکا تھا، کیا تیسری نسل بھی
پہلی اور دوسری نسلوں کی طرح زندگی گزارے گی؟ پھولوں کے
بغیر تلیوں کے بغیر؟ انھیں معلوم تھا کہ پھول اور تلیاں شاید
مینو کی قسمت میں ہی صرف کچھ دن اور رہیں۔ بیٹے کی آمدنی وہ
مانتے تھے گھر کا خرچ بھی جانتے تھے۔ بہت جلد بیٹے کے
آئین سے بھی پھول اکھڑ جائیں گے، تلیاں اڑ جائیں گی۔ وہاں
بھی جلد ہی سبز ماں آگ آئیں گی۔ انھیں سب کچھ معلوم تھا۔

لیکن مینو کو ان باتوں کا کیا پتہ۔ وہ پتھروں کا کامنا پھول
کے پھر پودوں کے درمیان گھومنے لگی تھی۔ اس نے بیگن کے لمبے
پتے ہاتھ سے چمچھے کیے اور گول گول بیگن دیکھ کر چپک اٹھی۔
”دادا! دیکھو کتنے بڑے آلو ہیں۔“

دادا اسکاٹے: ”مینو بیٹے، آلو نہیں بیگن۔“

”اچھا، بیگن۔ ایک توڑ لوں؟“

دادا ہوشیار ہو گئے، بیگن کی سبزی بیٹے اور بھوکے
کئی ہے، مینو انھیں ابھی سے توڑ لے گی تو خراب ہو جائیں
گے۔ انھوں نے اس سے کہا: ابھی نہیں کل توڑیں گے۔“

دونوں بوڑھوں کے لیے رات کو سبزی کی ضرورت نہیں تھی۔ صبح
وال پک جاتی اور رات تک چلتی۔ آئین میں سبز لیل کا چھوٹا سا
کھیت تھا، جب اُس میں سبزی آگتی تو گھر میں سبزی پکتی۔ ماں
صبح بیگن کے بڑے بڑے پتے اٹھا کر دو گول بیگن تماش
کر چکی تھی۔ چھوٹے ہیں مگر کیا ہوا، ایک وقت کا کام تو پل ہی
جانے گا۔

مینو نے دو قلمے کھانے کے بعد دودھ مانگا۔ ہواٹھ
کر باورچی خانے میں گئی اور بڑی بوتل بھر کر لے آئی۔ مینو
لیٹ کے ایک ہی سانس میں سارا دودھ پی گئی۔ دادی نے
سوچا، یہ پانچ بار میں سارا دودھ پی جائے گی۔ اس نے بہو کو
مشورہ دیا: کاکا! اسے روٹی کھلایا کرو۔ اناج پیٹ میں جائے
گا تو کچھ موٹی ہوگی۔ دیکھو تو کیسی سوکھی لگتی ہے۔“

ہوا اپنی زبان سے اپنے شوہر کا نام لیتی تھی۔ کتنے لگی
”میں کھلاتی ہوں تو سنتوش ناراض ہو جاتا ہے۔ کتنا ہے
اتنی جلدی اسے روٹی کھلانا شروع نہ کرو۔“

ماں سنتوش کی طرف دیکھنے لگی۔ بیٹا اسے کیسے سمجھاتا کہ
مینو کے ذریعے وہ دراصل اپنا بچپن خوشحال سے گزار رہا ہے۔
اسے آج بھی یہ بات یاد تھی کہ اُس نے جب سے ہوش سنبھالا
تھا، ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا اور چائے کا گلاس ہی رہا تھا: پتی لٹنی
کی ضد کرتی تو اسے اپنا گھناؤنا بچپن یاد آ جاتا۔ بچپن میں دوسرے
بچوں کو بازار کی کوئی چیز کھانے دیکھ کر اُس کی طبیعت کیسی لپٹا
تھی جب وہ ماں سے پیسوں کے لیے ضد کرتا تو ماں طور پر پٹائی
ہوتی کیونکہ گھر کا راشن وغیرہ خریدنے کے بعد ماں کے پاس کچھ
بچتا ہی نہیں تھا۔ اس وقت اسے اپنی ماں سے نفرت محسوس
ہوتی کتنی بڑی ہے ماں کبھی کچھ نہیں دیتی مگر اب اس کی کچھ
میں آگیا تھا کہ دراصل پیسے کی کمی اور اس کی غلط تقیم ایک خنجر
ہے۔ یہ خنجر تمام رشتے کاٹ کر پھینک دیتا ہے۔

دادا نے ناشتہ کر کے بڑی سلگائی۔ مینو نے ٹوکا: دادا!
یہ والا سگریٹ مت پیو، یہ گندا ہے۔ پاپا والا پیا کرو۔ دادا اٹھ
کر آئین میں چلے گئے۔

مینو کی ماں نے اسے ڈانٹا اور کہا: مینو! بڑوں سے اس
طرح نہیں بولتے۔ میں تمھارے پاپا سے کبھی اس طرح بولتی ہوں؟
”ہاں بولتی تو ہو کہ سگریٹ مت پیو، ٹوکا آتی ہے۔“

مینو بیگن کی پورٹی آئین میں گئی۔ وہاں ٹماٹر، بجنڈی اور
بیگن وغیرہ کے پورے تھے۔ مینو ایک ایک کر کے سب کے بالے
میں دادا سے پوچھتی رہی پھر بولی: میں انھیں پھولوں؟ خراب

”نہیں ابھی۔ بس ایک“

دودھ لے آؤں گا۔

مینو غٹ غٹ دودھ ختم کر گئی۔ پھر باورچی خانے کے دروازے پر کھڑی ہو کر دادی سے پوچھنے لگی: ”دادی! تم کیا پکا رہی ہو؟“

”اپنی بیٹی کے لیے کھیر پکا رہی ہیں۔ کھائے گی نا؟“

”ہاں مجھے کھیر بہت اچھی لگتی ہے۔“

سب لوگ دوپہر کے کھانے کے لیے بیٹھے۔ دادی نے کٹوری میں کھیر نکال کے سب سے پہلے مینو کے آگے رکھی مینو نے کھیر دیکھ کے غصے سے منہ پھیر لیا۔ دادی نے کہا: ”کھاؤ نا بیٹی!“

”میں نہیں کھاتی۔“ مینو نے جواب دیا۔

”کیوں؟“ سنتوش نے ذرا اونچی آواز میں پوچھا۔

”نہیں کھاتی۔ دادی نے کھیر میں بادام نہیں ڈالے۔“

دادی نے بیچارگی سے مینو کی طرف دیکھا پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی: ”بیٹی! کھیر میں بادام نہیں ڈالتے۔“

”دیکھو ماں! دادی جھوٹ بولتی ہے۔ تم تو بادام ڈالتی

ہو نا؟“

سنتوش تلخ آواز میں بولا: ”مینو! چپ چاپ کھیر کھا لو۔“

”نہیں کھاتی۔ دادی گندی ہے۔ دادا بھی گندے ہیں۔“

مجھے ایک بنگن نہیں توڑنے دیا۔ ہم اپنے گھر جائیں گے یہاں نہیں رہتے۔“

ماں سنتوش کا اندھا عقد جانتی تھی باپ بھی جانتا

تھا، بیوی بھی جانتی تھی لیکن مینو نہیں جانتی تھی۔ سنتوش صبح

سے ماں باپ کی چھوٹی چھوٹی مجبوریاں دیکھ رہا تھا۔ وہ اٹھ

کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اس کا ہاتھ لمبا ہوا، ذی من سے چسپکی

ہوئی مجبوریاں نے ایک نوحہ خوار جانور کا روپ دھار لیا۔

جانور اچھل کر ہاتھ پر آ بیٹھا، ہاتھ پوری قوت سے اٹھا اور

جانور نے مینو کے دائیں گال اور ناک کے آدھے حصے پر تڑاخ

کی آواز کے ساتھ پھلانگ لگا دی۔ مینو زمین پر لڑھک گئی۔

اس کا منہ کھل گیا لیکن منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ دادی

نے بیٹے کو دھکاتے کر پرے کیا اور مینو کا بدن سہلانے لگی۔

بچی کے اندر تنقید جنغ نے پورا زور لگایا اور سارے کمرے میں

پھیل گئی۔ اس کی چیخ دادا، دادی اور ماں کے دل میں چاقو

کی طرح گھسی۔ مینو کا چہرہ سوج گیا، ہونٹوں پر لہو کی لوند چکھنے

لگی۔ وہ لگتا مار چنچ رہی تھی۔ سنتوش نے کھانا چھوڑ کر سرگرمی

سنگالیا تھا۔ دادا نے بھی بیڑی سنگالی۔ بیوی مینو کو گود میں

لے کر بہلانے کی کوشش کرنے لگی پھر اسے اٹھا کر آٹھن میں پلٹی۔

دادا نے اسے پکڑ کر کپاری سے باہر نکالا: ”بچی! پر ضد سوار ہو گئی۔ وہ زور زور سے روتے لگی۔ دادی باورچی خانے سے باہر آ گئیں۔ مینو اپنی ماں کے پاس جا کے شکایت کر رہی تھی۔“

”ماں! دادا بہت گندے ہیں۔ مجھے توڑنے نہیں دیا۔“ دادی نے کہا: ”توڑ لینے دیتے جی! کیا فرق پڑتا ہے؟“ دادا تیز آواز میں بولے: ”توکل سبزی؟...“ انھیں ایک دم خیال آیا کہ بیٹے اور بہو کے سامنے یہ جملہ نہیں کہنا چاہیے۔ وہ کمرے سے چلے گئے۔

بہو ادھر سے چلے سے سب کچھ سمجھ گئی۔ ایسی غربت اس نے زندگی میں پہلی بار دیکھی تھی۔ اس نے شوہر سے کہا: ”سنتوش! یہ لوگ گھر کا خرچ کیسے چلانے ہوں گے؟ ہر مہینے یہاں کچھ بھیج دیا کرو۔“

شوہر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کیسے بتاتا کہ کہنا آسان ہے، بھیجنا مشکل کیسی کبھی یک مشت بڑی رقم بھی تو گھر میں دینی پڑتی ہے۔ بیوی کو شوہر کے جواب کا انتظار نہیں تھا، وہ جانتی تھی سنتوش کیا سوچ رہا ہے۔ وہ بھی یہ

حقیقت سمجھ چکی تھی کہ ایک رقم سے دوسری رقم چاہے کتنی بار گھٹاؤ باقی کچھ نہیں بچتا۔ یہ دونوں میاں بیوی زندگی کا سچ ہمیشہ برابر برابر تقسیم کر کے رکھتے تھے اس لیے تقصیر کہا نہیں والا

تھا اور ان کی زندگی میں کم ہی آتا تھا۔ اس نے شوہر کو مشورہ دیا: ”سنتوش! مینو تو ان کے چار پانچ روپے روز خرچ کرا دے گی۔ ایسا کیوں نہیں کرتے؟ ماں کو خرچ کے لیے کچھ روپے دے دو۔“

”میں نے بھی یہ سوچا تھا لیکن روپے دینے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ماں اس میں اپنی جھک محسوس کرے گی۔ اسے کتنا شوق اور ارمان تھا کہ مینو کچھ دن یہاں رہے۔ مجھ سے انھیں پوتی کا خرچ نہیں دیا جائے گا۔“

”ٹھیک ہے۔ یہاں سے لوٹنے کے بعد کچھ روپے منی آرڈر کر دینا۔“ مینو کو دوبارہ بھوک لگی۔ ہمیشہ کی طرح اس نے حکم دیا۔

”ماں! دودھ لاؤ۔ بھوک لگی ہے۔“ ”نہیں بیٹی! کھانا پک رہا ہے۔ آج تو ہماری بیٹی ہمارے ساتھ کھانا کھائے گی۔“

”ماں! تم بیک بیک مت کیا کرو۔ میں دودھ پیوں گی۔ ہاں۔“ بیوی نے شوہر کی طرف امداد طلب نگاہ سے دیکھا۔ شوہر بولا: ”یہ مانے گی بھلا؟ دے دو۔ میں تیار ہوں۔ اور سب بنگ



سنتوش اور اس کی بیوی نے سوچا، گھر میں کھانے کے بعد وہ مینو کو پھل کھلانے کے لیے کیسے منیش کرتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے گھومتے ہیں۔ وہ سونخڑے کرتی ہے اور پہلے اپنی کچھ ضدیں منواتی ہے پھر کچھ کھاتی ہے۔

دوپہر ہو گئی تھی۔ وہ مینوں دادا، دادی کے پاس کمرے میں لیٹے تھے۔ مینو اور اس کی ماں سو گئی تھی۔ سنتوش کو نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ غسل خانے جانے کے لیے اٹھا۔ کمرے اور غسل خانے کی کھڑکی مشترک تھی۔ اس کے ماں باپ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ سنو بی! شام کو بازار جا کر انڈے پھل اور تھوڑا سا دودھ لے آنا۔

سنتوش غصے میں پاگل ہو جاتا ہے۔ مینو کو پھر وار پیٹھے گا۔
”اچھا“

”پیسے ہیں؟ آفری دن ہیں ختم ہو گئے ہوں گے؟“
”نہیں ہیں۔ مانگ لوں گا کسی سے۔“

”سنتوش اگر جلد واپس جانے کے لیے کے تو روکنا مست۔“
ٹھیک ہی کرتا ہے جو یہاں نہیں آتا۔

ماں کا ایک ایک لفظ زہر کی طرح سنتوش کے جسم میں مزیت کر رہا تھا۔ یہی ماں ہے نہ آنے کی وجہ سے کس قدر ناراض تھی، جھگڑتی تھی، خط لکھتی تھی۔ ہماری آمد پر آج صبح اس کا چہرہ کتنا روشن تھا مگر اب؟ اب وہ چاہتی ہے کہ مینو اور اس کی ماں اور سنتوش آج ہی لوٹ جائیں۔ سنتوش نے دیوار پر لگا ہوا آئینہ دیکھا۔ اپنی سونی سونی آنکھوں میں اسے اپنے مستقبل کے چھوٹے چھوٹے منظر نظر آئے۔ مینو بڑی ہوگی، اس کی شادی ہوگی پھر وہ اپنے بچوں کے ساتھ اس کے گھر آئے گی تب شاید اس کے ساتھ بھی یہی کہانی دہرائی جائے۔ اس نے آنکھیں مل کے یہ مناظر مٹائے اور آج ہی واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔

شام کو سنتوش نے رکشا منگو لیا۔ وہ مینوں رکشا میں بیٹھے۔ ماں نے کہا: کا کا! یہ کیا؟ کچھ دن تو رہتے۔ وہ جھوٹا بل بھیجتی۔
”نہیں۔ ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔ پھر آئیں گے سنتوش بھی جھوٹا بل لے رہا تھا۔“

دادی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر مینو نے کہا: دادی! اچھے بچے روتے نہیں۔ میں پھر آ جاؤں گی۔ اب انڈا بھی نہیں مانگوں گی! دودھ بھی نہیں اور فروٹ بھی نہیں۔ پاپا غصے ہو رہے ہیں۔
رکشا روانہ ہو گیا۔ دادا، دادی دودھ تک مینو کا ہوا میں اٹھا ہوا، بائی بائی کرتا ہوا تھ دیکھتے رہے۔

بابو جی بھی غصے میں اپنے بیٹے کی طرح بے قابو ہو جاتے تھے انھوں نے بیوی سے کہا: جابل عورت! کبیر میں چار بادام نہیں ڈالے جاسکتے تھے؟“

”گھر میں بادام کہاں ہیں؟“

”اس گھر میں کبھی کچھ ہوا بھی ہے؟“

وہ جانتی تھی اس وقت جواب دینا ٹھیک نہیں ہے انھیں خود پتہ ہے کہ گھر میں بادام کبھی نہیں خریدے گئے۔ وہ ڈرتے ڈرتے بیٹے سے بولی: کا کا! تو پاگل ہو جاتا ہے۔ اتنا غصہ؟ کتنے زور سے مارا ہے۔ خون نکل آیا۔ کان چھٹ جاتا تو؟ بچی کو سمجھ تھوڑی ہے۔ اس کا کیا قصور؟ ”ماں زور دماغ میں جا بیٹھا“ اس کے مختلف حصے دماغ کے مختلف گوشوں میں تقسیم ہو گئے۔ سنتوش کو بھی معلوم تھا کہ تصویر بچی کا نہیں لیکن کیا ہو سکتا ہے؟ بیوی نے باہر سے اسے آواز دی: اب یہ چپ بھی نہی سے ہوگی۔ ذرا باہر آ کر اٹھا لو اسے۔“

سنتوش نے مینو کو گود میں لے لیا۔ وہ اس کے سینے پر سر رکھ کے اور زور سے رونے لگی لیکن اس نے اسے کہانیاں سنا کے جلد ہی منا لیا۔ مینو کے ہونٹ اور گال سوجھ ہوئے تھے۔ سب لوگ پھر کھانے کے لیے بیٹھے۔ مینو خاموشی سے بے بادام کی کھیر کھانے لگی۔ سنتوش ساتھ ساتھ اسے بھالو والی کہانی سنا رہا تھا۔ کھانا ختم ہو گیا۔ مینو نے دادی سے کہا: دادی! جلدی فروٹ لاؤ۔ میں کھا کر نیند کر دوں گی۔“

سنتوش نے گھور کر مینو کو دیکھا۔ مینو تھوڑی دیر پہلے کی مار بھولی نہیں تھی جھٹ بولی: پاپا! اچھے بچے فروٹ نہیں مانگتے نا؟“

”نہیں بیٹے۔“

”اچھا دادی! فروٹ مت لاؤ۔ دودھ ہے دو۔ میں سوؤں گی۔“